اسلام میں اختلاف کے آداب

(۷)

فقہاء کا اختلاف اور اس کے آداب (۱)

ترجمہ وتلخیص: جناب عبدالحی ابڑو صاحب - اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد

صحابہ وتابعین کی طرح ائمۂ فقہ کے درمیان بھی کئی اجتہادی مسائل میں اگرچہ اختلاف رونما ہوا، مگر ان کے اختلافات کے پیچھے ان کی ذاتی خواہشات یا افتراق و انتشار پیدا کرنے کا کوئی دانستہ جذبہ کار فرما نہ تھا، جس کی وجہ سے یہ حضرات راہِ ہدایت سے کبھی بھی ہٹنے نہ پائے۔ ان کی ساری تگ و دو کا مقصد چونکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول اور حق تک رسائی ہوتا تھا لہٰذا ہر دور کے اہلِ علم کے لیے اجتہادی مسائل میں فتویٰ دینے کی صلاحیت و اہلیت کے حامل مفتی حضرات کے فتاویٰ سے صرفِ نظر ممکن نہ تھا، البتہ ان کے خیال میں اگر فتویٰ درست ہوتا تو اُسے درست قرار دیتے اور اس میں کسی خامی کی صورت میں ان کے لیے استغفار کرتے اور ان کے بارے میں حُسنِ ظن سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح قاضیوں کا تعلق خواہ کسی بھی مکتبۂ فکر اور مسلک سے ہوتا، ان کے فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ضرورت پیش آنے پر خود قاضی اپنے خاص مسلک کے خلاف بھی فیصلے کرتے تھے اور ایسا کرنے میں کوئی حرج یا تنگی محسوس نہ کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان تمام حضرات کے دلائل اگرچہ مختلف ہوتے مگر وہ جس سرچشمہ سے سیراب ہوتے تھے، اس کا منبع ایک ہی تھا۔ ان کی احتیاط کا یہ عالم

محتاط رائے یا اجتہاد کا اظہار اس طرح کے الفاظ میں کرتے، جیسے: "ہذا احوط" (میری محتاط رائے یہ ہے) یا "ہذا احسن" (میرے خیال میں یہ بہتر ہے) یا "ہذا ما ینبغی" (یہ مناسب معلوم ہوتا ہے) یا "نکرہ ہذا" (ہمیں یہ بات اچھی نہیں لگتی) یا "لا یعجبنی" وغیرہ۔ اس طرح نہ تو کسی پر کوئی تنگی ہوتی اور نہ ہی الزام و اتہام تراشی۔ اسی طرح ایسی کسی رائے کے اظہار پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی، جس کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل موجود ہو۔ بلکہ لوگوں کے معاملات میں آسانی پیدا کرنے کے لیے پوری پوری وسعت اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

اختلافی مسائل کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ صحابہ و تابعین اور بعد کے فقہا میں سے کچھ حضرات بسم اللہ پڑھ کر نماز شروع کرنے کے قائل تھے۔ جب کہ کچھ حضرات ایسا کرنا پسند نہیں کرتے تھے، کچھ اسے بلند آواز میں پڑھتے تھے اور کچھ آہستہ، فجر میں کچھ لوگ دعائے قنوت پڑھتے تھے، کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ بعض کی رائے تھی کہ نکسیر پھوٹنے، قے آنے اور سینگی لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جب کہ دیگر حضرات اس رائے کے قائل نہ تھے۔ بعض کی رائے کے مطابق عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور بعض کے ہاں نہیں ٹوٹتا۔ اونٹ کا گوشت یا کوئی ایسی چیز جسے براہِ راست آگ نے چھوا ہو اس کے کھانے سے کسی کے ہاں وضو کرنا ضروری تھا اور کسی کے ہاں نہیں تھا۔

اس کے باوجود تمام حضرات ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ جیسے مدینہ منورہ کے مالکی اور دیگر ائمہ باوجودیکہ بسم اللہ نہ تو جہراً پڑھتے تھے اور نہ ہی سراً مگر امام ابوحنیفہؒ خود اور اُن کے ساتھی نیز امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ، ان کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک دن سینگی لگوانے کے بعد امامت کی، اور امام ابویوسفؒ نے بھی اس کی اقتدا میں نماز ادا کی اور بعد میں نماز کو لوٹایا نہیں حالانکہ ان کے مذہب میں پچھنے لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک تھا کہ نکسیر پھوٹنے اور سینگی لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ اگر وضو کرنے کے بعد امام کے بدن سے خون نکلے اور وہ دوبارہ

وضو نہ کرے تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ آپ نے جواب دیا: امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ (جیسے اماموں) کے پیچھے میں نماز پڑھنے سے کیسے گریز کر سکتا ہوں؟ (ان دونوں حضرات کے ہاں خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا)۔

امام شافعیؒ صبح کی نماز میں دعائے قنوت کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ بغداد میں امام ابو حنیفہؒ کے مزار کے قریب والی مسجد میں اُن کو صبح کی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے دعائے قنوت نہیں پڑھی، جب اُن سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "کیا اُن کی موجودگی میں میں اُن کے مسلک کی خلاف ورزی کی جرأت کر سکتا ہوں؟ پھر کہا: کبھی کبھی ہم اہلِ عراق کے مذہب پر بھی عمل کر لیتے ہیں[۱]۔

فقہاء میں امام مالکؒ اہلِ مدینہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلے میں ثقہ اور مستند سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں، اور عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور فقہائے سبعہ[۲] کے اقوال کا بھی انہیں سب سے زیادہ علم تھا۔ آپ اور آپ جیسے دیگر فقہاء کے ذریعے ہی علمِ روایت وفتوٰی کی بنیاد پڑی۔ آپ نے حدیث وفتوٰی کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور اپنی کتاب "المؤطا" تالیف کی جس میں اہلِ حجاز کی قوی روایات، صحابہؓ کے ثابت شدہ اقوال اور تابعین کے مستند فتاوٰی جمع کر دیئے۔ آپ نے اپنی کتاب کو فقہی ابواب کے مطابق بڑی عمدہ ترتیب دی ہے جو آپ کی چالیس سالہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ تاریخِ اسلام میں حدیث وفقہ کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ امام کے ستر معاصر علمائے حجاز نے اس کی تائید و توثیق کی۔ اس کے باوجود خلیفہ منصور نے جب اس کے چند نسخے تیار کروا کر دوسرے شہروں میں بھیجنے کا خیال ظاہر کیا تا کہ تمام لوگ صرف اس کے مطابق عمل کریں، تا کہ

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۳۵

۲۔ فقہائے سبعہ سے مراد ہیں: سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، خارجہ بن زید، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، سلیمان بن یسار، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود۔

اختلافات کا خاتمہ ہو، تو سب سے پہلے امام مالک رحؒ ہی نے اس تجویز کو رد کیا اور فرمایا: "امیر المومنین! آپ ایسا نہ کریں، اس لیے کہ لوگوں تک اس سے پہلے بہت سے اقوال اور احادیث و روایات پہنچ چکی ہیں، ہر ایک نے اپنے تک پہنچنے والی روایت کو اپنا لیا ہے جس سے ان کے درمیان خود ہی اختلاف رونما ہو چکا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے جو چیز اختیار کر لی ہے اسی پر آپ انہیں چھوڑ دیں" خلیفہ منصور ان کا جواب سن کر مطمئن ہو گیا اور کہا: ابو عبد اللہ! اللہ آپ کو مزید توفیق بخشے۔[۱]

یہ کتنے جلیل القدر امام تھے جنہیں یہ بات ناگوار تھی کہ لوگوں کو صرف ان کی تالیف کردہ کتاب پر عمل کا پابند بنایا جائے۔ حالانکہ اس کتاب میں انہوں نے احادیث و اقوال کا وہ بہترین ذخیرہ جمع کر دیا ہے جو ان کے نزدیک مستند اور قابلِ اعتماد تھا۔ اور جس کے بارے میں اہلِ مدینہ اور معاصر علماء کی اتنی بڑی جماعت کو کوئی اختلاف بھی نہ تھا۔

فقہاء کے آدابِ اختلاف کے چند نقوش امام مالک رحؒ فرماتے ہیں: "علمِ دین ایک ایسا علم ہے، جسے چار قسم کے لوگوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا: بیوقوف و احمق، نفس پرست جو گمراہی پھیلانے پر کمربستہ ہو، کذاب جو لوگوں کے معاملات میں دروغ گوئی سے کام لیتا ہو۔ خواہ روایتِ حدیث کے سلسلہ میں وہ متہم نہ ہو، اور ایسا شخص جو عابد و زاہد اور متقی تو ہو مگر اسے اس چیز کی صحت و ضعف کا علم نہ ہو جسے وہ بیان کر رہا ہے"۔[۲]

نیز آپ نے فرمایا: یہ علم دراصل دین ہی ہے، اس لیے جس شخص سے اسے حاصل کر رہے ہو، اس کے بارے میں غور و فکر سے کام لینا چاہیے۔ میں نے ستر علماء کو دیکھا جو مسجد نبوی کے ان ستونوں کے پاس بیٹھ کر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے تھے مگر ان میں سے کسی سے بھی میں نے کوئی روایت نہیں لی۔ ان میں سے کسی کو بھی اگر بیت المال کا نگران بنایا جاتا تو بلاشبہ وہ اس میں ذرہ برابر خیانت کے مرتکب نہ ہوتے،

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۰۷ اور الفکر السامی ۱/۳۳۶

۲۔ الانتقاء ص ۱۶

مگر اس عظیم الشان کام کے وہ بہرحال اہل نہیں تھے۔ دوسری طرف ابن شہاب (مشہور محدث امام زہری)، جب ہمارے ہاں تشریف لائے تو اُن کے دروازے پر ہر وقت علم کے متلاشی لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی" [1]

حقیقت یہ ہے کہ ان صفات کے حامل افراد کے درمیان کوئی بڑا اختلاف رونما ہونا بعید از امکان تھا۔ اور اگر تھوڑا بہت اختلاف واقع ہوا بھی تو وہ صرف حق کے لیے ہوا کرتا تھا۔ ان کے دلوں میں ہوا وہوس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ جن آداب اختلاف پر ہمارے علمائے سلف کاربند رہے ان کے چند نمونے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اپنے لیے ہم انہیں مشعلِ راہ بنا سکیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے فقہی مسالک میں جو فرق ہے وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ اسی طرح دونوں حضرات کے ہاں مروج اصول وضوابطِ اجتہاد کی بنیادیں بھی الگ الگ ہیں اور دونوں میں عمر کا بھی تفاوت تھا۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے احترام میں کوئی چیز مانع نہ ہوسکی۔ اور فقہ میں طریقہ کار کا اختلاف ان کے دلوں میں باہمی محبت اور احترام میں کمی کا سبب نہیں بننے پایا۔

قاضی عیاض اپنی کتاب "المدارک" میں لیثؒ بن سعد کی زبانی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں امام مالکؒ سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ سے کہا: کیا وجہ ہے کہ میں آپ کو اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: ابوحنیفہ سے گفتگو نے مجھے پسینہ پسینہ کر دیا ہے اے مصری! وہ بلاشبہ فقیہ ہیں"۔

امام لیثؒ نے کہا: اس کے بعد میں نے امام ابوحنیفہؒ سے ملاقات کر کے کہا: اس شخص نے (اشارہ امام مالک کی طرف تھا) آپ کے بارے میں کتنی اچھی بات کہی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: "صحیح جواب دینے اور بھرپور تنقید کرنے میں ان سے تیز خاطر آدمی میں نے نہیں دیکھا" [2]

---

[1] الانتقاء ص: ۱۲ [2] ایضاً

امام شافعیؒ اور امام محمدؒ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ایک روز میرا اور محمد بن الحسن کا مباحثہ ہوا، بات بڑھتے بڑھتے اختلاف کی حد تک پہنچ گئی - حتیٰ کہ یوں محسوس ہونے لگا گویا ان کی رگیں پھٹ پڑیں گی - اور بٹن ٹوٹ جائیں گے"[1]

امام محمدؒ کہتے ہیں: "اگر کبھی اختلافی مسائل میں ہم پہ کوئی شخص حاوی ہوا تو وہ شافعیؒ کے سوا کوئی اور نہیں"۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: "ان کے زور بیان اور غور سے بات سن کر پورے اعتماد و یقین کے ساتھ سوال و جواب کرنے کی خوبی کی بنا پر"[2]

علمائے اُمت کے آداب اختلاف کے ان نمونوں سے یہ نتائج نکلتے ہیں کہ قرونِ خیر میں بعد میں آنے والے حضرات نے اسلاف کے نقشِ قدم پہ چلنے اور ادبِ نبویؐ سے فیض یاب ہوتے رہنے کو اپنا شعار بنا لیا تھا - سلف صالحینِ آداب اختلاف میں صرف طنز و تعریض سے اجتناب نہیں کرتے تھے، بلکہ اس دور میں حصولِ علم پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے اور غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرنا ان کا شیوہ بن چکا تھا - نیز وہ نادانستہ غلطی کے ارتکاب کے خوف کی بنا پہ فتوٰی دینے سے احتراز کرتے تھے۔

مؤلف "القوت" عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی ایک روایت نقل کرتے ہیں، جس میں انہوں نے بیان کیا: اس مسجد میں (اشارہ مسجد نبوی کی طرف ہے) میں نے ایک سو بیس صحابہؓ کو اس حال میں دیکھا کہ ان میں سے کسی سے اگر کوئی حدیث یا فتوٰی پوچھا جاتا تو اس کی یہی خواہش ہوتی کہ کوئی دوسرا بھائی ہی اس کے متعلق بتلائے - بالفاظِ دیگر کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ دوسرے کے پاس بھیجتا اور وہ کسی اور کے پاس، اس طرح سائل گھومتے ہوئے پھر اس شخص کے ہاں واپس پہنچتا جس سے پہلی مرتبہ اس نے سوال پوچھا تھا[3]

اس سلسلے میں وہ سبکی یا شرمندگی کے جذبات و احساس سے بالا ہو چکے تھے - یہ غلطی کا خدشہ

---

[1] الانتقاء ص: ۱۶

[2] ایضاً ص ۸۳

[3] اتحاف السادۃ المتقین ۱/۲۷۹ - ۲۸۰

ہی تھا، جو انہیں بعض اوقات کسی مسئلے کے جواب میں توقف پر مجبور کر دیتا تھا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص امام مالکؒ سے کوئی مسئلہ پوچھنے کے لیے حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس کی قوم نے اسے یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے ایسی جگہ سے بھیجا ہے جس کا فاصلہ یہاں سے چھ ماہ کا ہے۔ آپ نے کہا: جس نے تمہیں بھیجا ہے اس سے جا کہ کہہ دو کہ میں یہ مسئلہ نہیں جانتا۔ اس شخص نے کہا: پھر اسے کون جانتا ہے؟ آپ نے فرمایا: "وہی جسے اللہ نے اس کا علم دیا ہے۔ ملائکہ نے کہا تھا " لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا " البقرہ: ۳۲ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا تو نے ہمیں سکھایا ہے۔

امام مالکؒ ہی کے متعلق یہ بھی مروی ہے کہ ان سے اڑتالیس مسئلے پوچھے گئے جن میں سے ۳۲ کے بارے میں آپ نے کہا " لا ادری "میں نہیں جانتا "۔

خالد بن خداش کہتے ہیں: " میں عراق سے چالیس مسئلے معلوم کرنے کے لیے امام مالکؒ کے ہاں حاضر ہوا، جن میں سے آپ نے صرف پانچ کے جواب دیئے "۔

ابن عجلان کہتے ہیں: " اگر عالم " لا ادری " کہنا چھوڑ دے تو ہلاکت و بربادی اس کا مقدر ہو گا "۔

امام مالکؒ، عبداللہ بن یزید بن ہرمز سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: " عالم کو چاہیے کہ اپنے ہم نشینوں کو " لا ادری " کہنا سکھائے تاکہ ان سے جب کسی ایسے مسئلے کے بارے میں سوال کیا جائے جس کا جواب انہیں معلوم نہ ہو تو وہ " لا ادری " کہہ کر اپنی جان بچا سکیں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں: حضرت ابوالدرداءؓ سے یہ صحیح روایت مروی ہے کہ انہوں نے کہا: " لا ادری " کہنا آدھا علم ہے۔

(باقی)